POSTED AT NDPSO ON 3-4 FEBRUARY 2003
U (C) 160/2003 TO POST WITHOUT PREPAYMENT
POSTAL REGN. NO. DL-11186/2003 R.N.I NO. 2186/57

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

۸ تا ۱۴ فروری ۲۰۰۳ء (08-14 FEBRUARY 2003)

شمارہ نمبر:۶ جلد نمبر:۶۲

دہلوی تہذیب کا آخری یادگار نمونہ بیگم حمیدہ سلطان احمد بھی ہم سے جدا ہو گئیں

سیاسی، تاریخی، تہذیبی اور علمی و تعلیمی لحاظ سے دہلی ہندوستان کا اہم ترین شہر رہا ہے۔ چار پانچ ہزار سال سے آباد اس شہر نے نہ جانے کتنے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ کتنے ہندو اور مسلمان حکمرانوں کو دیکھا اور کتنے عروج و زوال دیکھے۔ انگریزوں کی غلامی برداشت کی اور بالآخر دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دارالخلافہ ہونے کا شرف حاصل کیا۔

دلی ہندوستان کے دارالحکومت ہی کا نام نہیں بلکہ صدیوں سے ایک عظیم تہذیب کا نمونہ اور قدیم تمدن کا گہوارہ رہی ہے۔ روشنی کا ایک ایسا مینار جس کے آگے سمرقند و بخارا اور بغداد کی شہرت بھی ماند پڑ گئی تھی۔ یہ وہ سرزمین ہے، جہاں ہند ایرانی یعنی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب نے جنم لیا تھا۔ یہاں علم و فن عروج کی انتہائی منزلوں پر پہنچا۔ اس سرزمین کی مٹی کو آسمان کے ستارے اپنی پلکوں سے اٹھاتے تھے۔ یہاں کے حکمرانوں کی تلوار کی ایک جنبش سے ہزاروں قسمتوں کے فیصلے ہوتے تھے۔ اسی دلی میں حملہ آوروں کی بدولت اکثر قتل و غارت گری کا بازار بھی گرم رہتا اور یہیں کی فضاؤں میں صوفی سنتوں کا وہ آدیش بھی گونجتا تھا جو انسان کے زخموں پر مرہم کا کام کرتا اور انسان کو زندہ رہنے کا سلیقہ سکھاتا۔

بیرونی حملہ آوروں کے علاوہ دہلی نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، سکھوں، جاٹوں، روہیلوں اور پھر انگریزوں کے ظلم و ستم کا شکار رہی۔ لیکن نہ جانے کس فقیر کی دعا تھی کہ دہلی لٹی، برباد ہوئی لیکن کچھ ہی عرصے بعد پھر آباد ہوئی اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی۔

دہلی علم و فن کا ایک عظیم گہوارہ رہی ہے اور اس ہند ایرانی تہذیب کا مرکز رہی ہے جو ایک ہزار سال سے ہندو مسلمانوں کے میل جول کا نتیجہ تھی۔ ہند ایرانی تہذیب نے ہندوستان کے تمام علاقوں کی تہذیبوں کو متاثر کیا۔ افسوس ہے کہ ۱۹۴۷ء میں بہت بڑے پیمانے پر انتقال آبادی نے اس تہذیب کو بری طرح متاثر کیا۔ بیشتر خاندان جو ہند ایرانی تہذیب کا اعلان ترین نمونہ تھے، ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان کے مختلف شہروں میں بکھر گئے۔ پاکستان سے جو مہاجرین آئے وہ اپنے ساتھ ہندوستان کے مختلف علاقوں کی تہذیبیں لائے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دلی کی تہذیب مختلف علاقوں کی تہذیبوں میں دب کر رہ گئی۔ دہلی میں اب دو چار ہی خاندان ایسے موجود ہیں جنھیں اس تہذیب کا آخری نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ ان ہی میں ایک خاندان بیگم حمیدہ سلطان احمد کا ہے، جنھیں ہم لوگ احتراماً حمیدہ آپا کہتے تھے۔ ۱۹؍ جنوری ۲۰۰۳ء کو ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

حمیدہ آپا اپنی ذات سے ایک انجمن تھیں۔ آزادی کے بعد جن لوگوں نے اردو زبان کے تحفظ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ان میں حمیدہ آپا کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ آپا نے صرف زبان کے تحفظ ہی کے لیے جدوجہد نہیں کی بلکہ اردو زبان و ادب دونوں کی ترقی و فروغ کے لیے بھی بہت نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ پچھلے چالیس سال کی دہلی کی ادبی تاریخ لکھنے والا کوئی مورخ آپا کی بے لوث خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ آپا پچھلے چالیس

خلیق انجم

سال سے انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کی سکریٹری تھیں۔ انھوں نے کوشش کر کے انجمن کے لیے علی منزل نام کی ایک عمارت حاصل کی۔ علی منزل کا باقاعدہ ایک ٹرسٹ ہے جو اس عمارت کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ آپا اس عمارت کے ایک حصے میں رہتی تھیں۔ پچھلی چار دہائیوں کے دوران علی منزل کی غیر معمولی اہمیت رہی ہے۔ اردو کا کون سا مشہور، ممتاز اور صف اول کا ادیب اور شاعر ایسا ہے جو دہلی میں رہتا ہو یا دہلی آیا ہو اور انجمن ترقی اردو (دہلی) کے زیر اہتمام پابندی سے منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں شریک نہ ہوا ہو۔ مجاز، روش صدیقی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، جسٹس آنند نرائن ملا، مجاز لکھنوی، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، بہار برنی، ساغر نظامی، ذکیہ ساغر، عزیز وارثی، بیگم ممتاز مرزا، انجم پرویز، بسمل سعیدی، گوپال متل، مخمور سعیدی، رفعت سروش وغیرہ علی منزل کی ادبی محفلوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ بیشتر شاعروں اور ادیبوں کو پہلی بار ہم نے علی منزل ہی میں دیکھا تھا اور یہیں ان کی تقریریں یا کلام سننے کا موقع ملا تھا۔

حمیدہ آپا دلی کے ایک مشہور محلے گلی قاسم جان کی اس حویلی میں ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئی تھیں جو نواب مرزا ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کی ملکیت تھی۔ نیر درخشاں چھوٹے صاحب زادے تھے نواب احمد بخش والی فیروز پور جھرکہ لوہارو کے۔ کچھ اور کہنے سے پہلے اس خاندان کے بارے میں کچھ اہم اطلاعات فراہم کر دوں۔

وسط ایشیا کے ترکستان کے ایک شہر یارقند میں ایک بزرگ تھے جن کا نام تھا خواجہ محمد امین۔ یہ خواجہ احمد یسوی کی نسل سے تھے۔ اس علاقے کے لوگ اپنے نام کے ساتھ خواجہ لکھتے تھے۔ ان کا تعلق سادات سے تھا اور مغلوں اور

دہلی میں اردو اور پنجابی کو بہت جلد دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے گا

غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور ڈاکٹر شاہد ماہلی صاحب پر مشتمل ایک وفد نے ڈاکٹر خلیق انجم کی قیادت میں ۲۳؍ جنوری ۲۰۰۳ء کو دہلی کی وزیر اعلا محترمہ شیلا دکشت سے ملاقات کی۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے شیلا جی کو بتایا کہ انجمن ترقی اردو نے دہلی کے تمام اردو ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ مل کر دہلی کی دوسری سرکاری زبان کا بل مرتب کیا تھا اور جسے معمولی سی ترمیم کے بعد دہلی اسمبلی نے منظور کر لیا تھا۔ ہم لوگ خوش تھے کہ اب اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل جائے گا لیکن اتنا عرصہ گزر گیا ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔

شیلا دکشت نے بتایا کہ وہ شرمندہ ہیں کہ ابھی تک اردو کے سلسلے میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ بل مرکزی حکومت کی منظوری کے لیے بھیجا گیا تھا۔ طویل عرصے تک ہوم منسٹری میں یہ بل پڑا رہا، میں نے کوشش کر کے فائل منگوایا اور نوٹی فکیشن کے لیے گورنر کے پاس بھیج دیا۔ گورنر نے اس پر ایک ایسا اعتراض کر دیا جس کی وجہ سے فائل کو پھر یہیں ہوم منسٹری بھیجنا پڑا۔ یہ فائل ہوم منسٹری کے پاس ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ بہت جلد میں خود منسٹری جا کر اس فائل کے سلسلے میں بات کروں گی۔ وفد نے وزیر اعلا سے درخواست کی کہ جب تک یہ بل منظور نہ ہو کم سے کم دہلی کے تمام دفاتر میں ایک ایک اردو مترجم رکھ دیا جائے۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے، جب تک کہ زبان کا بل منظور نہ ہو جائے اور اس کا نوٹی فکیشن جاری نہ ہو جائے۔

وفد نے وزیر اعلا سے درخواست کی کہ اس سلسلے میں جو بھی کچھ کرنا ہے جلد کیجیے کیوں کہ اردو والے بڑی بیتابی سے اس دن کا انتظار کر رہے ہیں، جب اردو اور پنجابی کو دہلی کی دوسری سرکاری زبانیں تسلیم کر لیا جائے گا۔ (ادارہ)

پٹھانوں میں اُن کی شادیاں ہونے کی وجہ سے ایک نئی نسل وجود میں آ گئی تھی اس لیے اس خاندان میں علوی اور مغل برلاس کا نسل تھا۔ خواجہ محمد امین، امیر معصوم (شاہمراد بیگ خلف امیر دانیال) کے دادا کے معلم تھے۔ امیر دانیال وہ بزرگ تھے جو چنگی جان اور امیر بخارا کے نام سے مشہور تھے۔ خواجہ محمد امین کے صاحب زادے خواجہ رحمت اللہ تورہ تھے، جن کا بخارا میں انتقال ہوا۔ تورہ ایک اعزازی لقب تھا جو بادشاہ کی طرف سے اس خاندان کو ملا تھا۔ خواجہ رحمت اللہ کے دو صاحبزادے تھے سعیداللہ خاں اور عبدالرحمٰن بیگ خاں، یہ دونوں بھی بخارا ہی میں خدا کو پیارے ہوئے۔ عبدالرحمٰن بیگ خاں کے تین صاحب زادے تھے قاسم جان، عالم جان اور عارف جان۔

اب تک جن شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ایک ایسی تاریخ کا حصہ ہیں جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ ہاں! یہ تین بھائی جن کا ذکر ہوا ہے، ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہیں اور یہی ہماری حمیدہ آپا کے اجداد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تینوں بھائی مغل بادشاہ شاہ عالم کے زمانے میں دلی آئے۔ قاسم جان نے شاہ عالم کے عہد میں غیر معمولی جانبازی اور بہادری کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے انھیں مغل حکومت کی طرف سے نواب شرف الدولہ سہراب جنگ کے خطاب سے نوازا گیا۔

عارف جان کے صاحب زادوں میں محمد بخش خاں، احمد بخش خاں اور الٰہی بخش خاں معروف تھے۔ ان میں احمد بخش خاں بہت حوصلہ مند، بہادر اور جانباز تھے۔ انھوں نے مہاراجہ الور کی جانب سے مہمات میں شرکت کی اور لارڈ لیک کا ساتھ دیا۔ اُن کی دلیری اور بہادری سے متاثر ہو کر انگریز حکومت نے فیروز پور جھرک، پونا ہانہ بچھور، گجینہ جاگیر کے طور پر اُن کو دیا اور نواب فخر الدولہ رستم جنگ دلاور ملک کے خطابات سے نوازا۔ احمد بخش خاں معروف وہی بزرگ ہیں جنھوں نے اپنی صاحب زادی امراؤ بیگم کی شادی مرزا اسداللہ خاں غالب سے کی تھی۔ مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں جن میں بنیادی بیگم بڑی تھیں اور امراؤ بیگم چھوٹی۔ بڑی بہن بنیادی بیگم کی شادی نواب غلام حسین مسرور سے ہوئی۔ بنیادی بیگم کے دو صاحبزادے تھے زین العابدین خاں عارف اور حیدر حسن خاں۔

غالب کے یہاں سات بچے پیدا ہوئے لیکن ان سب کا کم عمری میں انتقال ہو گیا۔ زین العابدین خاں عارف غالب کی بیوی امراؤ بیگم کی بڑی بہن بنیادی بیگم کے صاحبزادے تھے۔ غالب اور ان کی بیوی نے عارف کو متبنیٰ کرلیا۔ غالب کو عارف سے غیر معمولی محبت تھی۔ انھوں نے عارف سے اپنی محبت کا اظہار اس فارسی قطعے میں کیا ہے:

آں پسندیدہ خوے عارف نام
کہ رخش شمع دودمان من است
آں کہ در بزم قرب و خلوتِ انس
غمگسار و مزاج دان من است

۱۸۵۳ء کے اواخر یا ۱۸۵۴ء کے اوائل میں عارف کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور اپریل ۱۸۵۴ء میں عارف بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ عارف کے دو بچے تھے جو والدین کے انتقال سے بے یار و مددگار ہو گئے۔ بڑا لڑکا حسین علی خاں تھا اور دوسرا باقر علی خاں۔ بڑے لڑکے کو غالب اپنے گھر لے آئے اور چھوٹے لڑکے باقر علی خاں کی پرورش کی ذمے داری ان کی دادی نے لے لی۔ کچھ ہی دن کے بعد دادی کا بھی انتقال ہو گیا اس لیے باقر علی خاں کو بھی غالب اپنے گھر لے آئے۔ غالب کے مختلف اردو خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ان دونوں بچوں سے کتنی محبت تھی۔

حمیدہ آپا نے اپنی کتاب "خاندانِ لوہارو کے شعرا" میں باقر علی خاں کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ باقر شاعر تھے اور کامل تخلص کرتے تھے۔ باقر علی خاں کی تین صاحبزادیاں تھیں۔ محمد سلطان بیگم عرف چندو بیگم، ان سے بھی غالب کو بہت محبت تھی اور وہ انھیں پیار سے مرزا جیون بیگ کہا کرتے تھے۔ باقر علی کی دوسری صاحبزادی فاطمہ سلطان بیگم اور سب سے چھوٹی صاحبزادی رقیہ سلطان بیگم تھیں جن کی شادی لیفٹننٹ کرنل ذوالنور علی احمد سے ہوئی تھی۔ یہی رقیہ سلطان بیگم اور کرنل ذوالنور علی احمد، حمیدہ آپا کے والدین ہیں۔ حمیدہ آپا کے ننھیال کے بارے میں خاصی تفصیلات بیان کی جا چکیں، اب کچھ باتیں ان کی ددھیال کے بارے میں۔

کرنل ذوالنور کا خاندان اصلاً عرب تھا جس کا سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا تھا۔ ان کے آبا و اجداد مغل بادشاہوں کے زمانے میں دلی آئے اور انھوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ جب اورنگ زیب نے آسام پر چڑھائی کی اور میر جملہ دلی سے فوج لے کر آسام پہنچے تو حمیدہ آپا کے آبا میں سے ایک بزرگ بھی فوج کے ساتھ آسام گئے۔ ان بزرگ نے آسام کے ضلع سب ساگر کے سب ڈویژن گولا گھاٹ کے کچاری ہاٹ کے گاؤں میں سکونت اختیار کرلی۔ یہیں ان کے ایک بیٹے قاضی خلیل الدین احمد پیدا ہوئے۔ ان کے صاحبزادے حمیدہ آپا کے پردادا قاضی پرویز علی احمد تھے جو جرنل کہلائے جاتے تھے۔ جرنل کیوں کہلائے جاتے، اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی پرویز علی احمد انتہائی نیک، شریف، ایماندار، خدا ترس اور مذہبی انسان تھے۔ آسام میں ایک اور صاحب تھے منظور علی احمد۔ یہ آسام کے راجا کے دربار میں دلی کے بادشاہ کی طرف سے سفیر کی حیثیت سے متعین تھے۔ انھوں نے آسام ہی میں شادی کی تھی۔ ان کی ایک صاحبزادی تھیں زیب النسا بیگم۔ قاضی خلیل احمد کی شادی منظور علی صاحب کی انھی صاحبزادی سے ہوئی۔ خلیل احمد صاحب کے ہاں دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکوں کے نام تھے قاضی دانش محمد، ذوالنور اور لڑکی کا نام تھا نصیر النسا۔ قاضی دانش محمد کے دو لڑکے تھے وجیہ الدین احمد، جن کا جوانی میں انتقال ہو گیا اور دوسرے تاج الدین احمد۔ تاج الدین نے شادی کی لیکن اولاد نہیں ہوئی۔ قاضی دانش محمد مرحوم کی ایک بیٹی تھیں قریش زوری بانو۔ نصیر النسا بیگم کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام تھے اکرام رسول، شفیق رسول، رفیق رسول، انعام رسول اور بیٹیوں کے نام تھے عمدۃ النسا، زبیدۃ النسا، قدوۃ النسا اور ساجدہ اختر۔ ذوالنور علی احمد صاحب ۱۸۳۹ء میں گولا گھاٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم آسام میں ہوئی۔ وہ ایک ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ انھیں بچپن ہی سے سائنس میں غیر معمولی دل چسپی تھی۔ ذرا عمر بڑھی تو مغربی طب میں دل چسپی پیدا ہو گئی۔ اس وقت آسام میں میڈیکل کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ذوالنور صاحب کے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے اُن کی والدہ نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھیں کلکتہ بھیج دیا جہاں کلکتہ یونیورسٹی میں انھوں نے اعلا تعلیم حاصل کی۔ اس یونیورسٹی میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد ان کی والدہ نے اپنا زیور بیچ کر مزید تعلیم کے لیے انھیں انگلینڈ بھیج دیا جہاں انھوں نے ۱۸۶۶-۶۷ء میں ایڈن برا یونیورسٹی سے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۶۴ء میں ذوالنور احمد صاحب انڈین میڈیکل سروسز کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور شاندار کامیابی حاصل کی۔ وہ پہلے مسلمان تھے جو اس امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہاں ذوالنور احمد صاحب کے ایک دوست آنند رام بروا کا ذکر بھی ضروری ہے۔ بروا صاحب گوہاٹی کے رہنے والے تھے، سنسکرت ادب میں انھوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ جب ذوالنور احمد صاحب کلکتہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو وہیں بروا صاحب سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات نے بہت جلد دوستی کی شکل اختیار کرلی۔ دل چسپ اتفاق یہ ہے کہ یہ دونوں اعلا تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد دونوں ہی مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہوئے۔ ذوالنور احمد صاحب انڈین میڈیکل سروسز کے امتحان میں اور بروا صاحب انڈین سول سروسز کے۔ دونوں امتحان میں شاندار طریقے سے کامیاب ہوئے اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ ان دونوں کا تقرر آسام کے ضلع سب ساگر میں ہوا۔ ذوالنور احمد صاحب سول سرجن کے عہدے پر فائز ہوئے اور بروا صاحب اسسٹنٹ کمشنر کے۔ ان دونوں کی دوستی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ایم اے ہانڈو نے ایک ایسا واقعہ لکھا ہے، جس نے ذوالنور احمد صاحب اور اس کے بعد اس خاندان کی آنے والی نسلوں پر گہرا اثر ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ:

"۱۸۷۳ء کے آس پاس اس زمانے کے آسام کے چیف کمشنر نے سب ساگر کا دورہ کیا۔ اس موقع پر چیف کمشنر کے اعزاز میں ڈپٹی کمشنر نے ایک ڈنر دیا۔ اس ڈنر پر دو ہندوستانیوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ یہ ہندوستانی حضرات تھے ذوالنور احمد صاحب اور آنند رام بروا صاحب۔ یہ اس زمانے میں ہندوستانیوں کے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی کہ انھیں ڈنر پر مدعو کیا گیا۔ لیکن ڈنر میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے ان دونوں ہندوستانی نوجوانوں کی خوشی کو ختم کر دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ جب ذوالنور احمد صاحب اور بروا صاحب ڈنر کے مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے لیے الگ میز لگائی گئی ہے۔ یعنی ہندوستانی ہونے کے ناطے انھیں انگریزوں کے ساتھ میز پر کھانا کھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حالاں کہ یہ دونوں کئی سال تک انگلینڈ میں رہے تھے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کو پوری طرح اپنا لیا تھا۔ وہ کھانا کھانے کے مغربی آداب سے بھی بخوبی واقف تھے۔ لیکن تعصب کی وجہ سے اور کچھ اس لیے بھی کہ ہندوستانیوں کو یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ غلام ہیں، انھیں الگ بٹھایا گیا۔ یہ دونوں نوجوان تھے اور ابھی کیریر کا آغاز تھا۔ پوری زندگی سامنے پڑی تھی۔ اگر چاہتے تو اس بے عزتی کو برداشت کرلیتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور دونوں احتجاج کے طور پر کھانا کھائے بغیر واپس آگئے۔ صاحبانِ انگریز کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی تھی۔ متعلقہ افسر آگ بگولا ہو گئے۔ یہ تو مناسب نہیں سمجھا کہ ان دونوں کو ملازمت سے برطرف کر دیں۔ لیکن اتنا ضرور کیا کہ ان کا دور دراز علاقوں میں تبادلہ کر دیا۔ ذوالنور احمد صاحب کو صوبہ سرحد میں بھیج دیا گیا اور بروا صاحب کو اپنے وطن سے دور بنگال۔ اگرچہ ذوالنور احمد صاحب اپنی ذلت کو نہیں بھولے لیکن وہ اپنے پیشے میں مخلص رہے اور لوگوں کا ایمانداری سے علاج کرتے رہے۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے حاکموں نے ذوالنور احمد صاحب کی ڈنر پر باغیانہ حرکت کو معاف کر دیا اور انھیں آرمی میڈیکل کارپس میں شامل کرلیا۔ یہاں انھوں نے محنت اور لگن سے اپنے افسروں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ لیفٹننٹ کرنل کے عہدے پر فائز کر دیے گئے۔ کچھ ہی عرصے بعد ذوالنور احمد صاحب کی ترقی کا وقت آیا۔ انھیں پورا کرنل بنایا جانا تھا یا انسپکٹر جنرل آف سول ہاسپٹلز، لیکن انھیں کسی بھی عہدے پر ترقی نہیں دی گئی۔ اس کے اسباب کیا تھے، یہ بتانا مشکل ہے۔ لیکن ذوالنور صاحب کے ذہن میں غالباً یہ تھا کہ چوں کہ وہ ہندوستانی ہیں اس لیے انگریز افسروں نے حق تلفی کرتے ہوئے انھیں ان کے جائز حق سے محروم رکھا۔"

فخرالدین علی احمد صاحب پر مقالہ لکھنے کے لیے کچھ سال قبل میں نے حمیدہ آپا کا انٹرویو لیا تھا۔ انھوں نے اس واقعے پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا تھا

شاہ مشتاق احمد- اردو تحریک کے اہم ستون

انوار الحسن وسطوی (آشیانہ کالونی، حاجی پور [ویشالی] بہار)

مجاہد آزادی، سابق رکن اسمبلی اور بہار میں اردو تحریک کے اہم ستون شاہ مشتاق احمد کا انتقال ملک و ملت کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مرحوم شاہ مشتاق احمد بہار میں اردو تحریک کے قافلہ سالاروں میں تھے۔ اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے انھوں نے انجمن ترقی اردو بہار کے پلیٹ فارم سے جو جد و جہد کی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کئی برسوں تک بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے صدر کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ مرحوم شاہ صاحب صرف اردو کے مجاہد ہی نہیں، ایک بیدار مغز سیاست داں اور قابل ذکر مدبر بھی تھے۔ سیاست پر جہاں ان کی گہری نظر تھی وہیں وہ ملی مسائل اور اردو کاز سے بھی گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ ان کی اردو دوستی کے اعتراف میں انھیں بہار اردو اکادمی کا سکریٹری، پھر وائس چیرمین بنایا گیا۔ ان کے دور میں اردو اکادمی بہت ہی فعال رہی۔ ان کے ملی جذبے کی قدر کرتے ہوئے انھیں بہار سنّی وقف بورڈ کا چیرمین بھی بنایا گیا۔ اس عہدے پر فائز رہ کر انھوں نے بہار کی وقف املاک کی حفاظت کے لیے موثر اقدام کیے۔ انھوں نے ان تمام عہدوں کو زینت بخشی اور اپنے حسن کارکردگی اور حسن اخلاق سے لوگوں کو متاثر کیا۔

شاہ مشتاق احمد مجاہد آزادی اور کانگریس رہنما شاہ محمد زبیر کے صاحبزادے تھے۔ شاہ محمد زبیر کا انتقال آزادی سے سترہ سال قبل ہی ہو گیا تھا۔ اگر ان کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو بہار کی سیاسی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ مقامی، صوبائی اور ملکی سطح پر شاہ محمد زبیر کا مرتبہ و مقام کیا تھا، انھوں نے کیسے کیسے مجاہدین آزادی پیدا کیے اور ان کی تربیت و سرپرستی فرمائی، جنگ آزادی کی چنگاری کو انھوں نے کس طرح شعلۂ جوالا بنایا، انھوں نے کون کون سے کارہائے نمایاں انجام دیے، ان باتوں کے تفصیلی ذکر کا یہاں موقع نہیں لیکن صرف ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے شاہ محمد زبیر کی شخصیت اور ان کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ جب انگریزی حکومت کے زیر انتظام پہلی دفعہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخابات منعقد ہوئے تو شاہ محمد زبیر مونگیر ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین منتخب کیے گئے اور شری کرشن سنہا وائس چیرمین بنائے گئے۔ یہ وہی کرشن سنہا ہیں جو آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد تا حیات بہار کے وزیر اعلا رہے تھے۔ شاہ محمد زبیر کے انتقال (۱۹۳۰ء) کے بعد جب شری بابو مونگیر ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین کے عہدے پر فائز کیے گئے تو وہ احتراماً اس کرسی پر کبھی نہیں بیٹھے جس پر شاہ محمد زبیر بیٹھ چکے تھے۔ بورڈ کی میٹنگوں میں چیرمین کی کرسی خالی ہی رہتی تھی۔ یہ تھا شاہ محمد زبیر کا سیاسی قد اور ان کی شخصیت کی بلندی۔

مرحوم شاہ مشتاق احمد نے اپنے والد محترم شاہ محمد زبیر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خود کو کانگریس پارٹی سے ہی منسلک رکھا۔ وہ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی منتخب ہوئے اور سکندرہ و شیخ پورہ حلقے کی نمائندگی کی۔ انھوں نے اپنے اسمبلی حلقے کی خدمت بحسن و خوبی انجام دی۔ کانگریس پارٹی سے وابستگی کے باوجود ملی مسائل اور اردو کے سلسلے میں ملک کی کانگریسی حکومتوں کے موقف سے وہ نالاں اور دل برداشتہ تھے اس لیے شاہ مشتاق احمد پچھلی دہائی میں کانگریس کے کٹر مخالف الحاج غلام سرور کے ساتھ مل کر ملی قیادت میں دل چسپی لینے لگے اور اردو کاز کی لڑائی میں ان کے ساتھ ہو لیے۔ یہ وہ دور تھا جب الحاج غلام سرور، شاہ مشتاق احمد، مولانا بیتاب صدیقی، سید تقی رحیم اور پروفیسر عبد المغنی بہار کے مسلمانوں کے صف اول کے قائدین تصور کیے جاتے تھے۔ ان قائدین نے حکومت وقت سے لڑائیاں لڑیں اور اردو کے مسائل کے حل کے لیے تحریکیں چلائیں جس کے نتیجے میں اردو بہار میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر سکی۔

شاہ مشتاق احمد کی رحلت پر روزنامہ "قومی تنظیم" پٹنہ نے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۲ء کو شاہ مشتاق کی رحلت کے عنوان سے اداریہ تحریر کرتے ہوئے جہاں انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہیں نئی نسل

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

کہ دہلی میں ۱۹۰۳ء میں ایڈورڈ ہفتم کا دربار تھا۔ اس سلسلے میں کرنل ذوالنور کو بہت زیادہ ذمے داریاں سونپی گئیں۔ پچاس ہزار سپاہیوں کا انھیں انچارج بنایا گیا۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے کچھ راجا اور نواب بادشاہ کے باڈی گارڈ تھے۔ ان کی صحت کا خیال رکھنا بھی ذوالنور صاحب کی ذمے داری تھی۔ ان کی خدمات سے حکومت بہت خوش تھی اس لیے ذوالنور صاحب کا یہ خیال غلط نہیں تھا کہ انھیں ترقی دی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان کے ایک جونیر انگریز کو فل کرنل بنا دیا گیا۔ اس واقعے کا ان کے دل پر اتنا اثر پڑا کہ وہ بیمار ہو گئے۔ ڈیڑھ سال تک بیمار رہ کر صحت یاب ہوئے تو ۱۹۰۵ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ اب انھیں عام آدمیوں کی خدمت کا موقع ملا۔ ۱۹۳۱ء میں کرنل ذوالنور احمد کا انتقال ہوا۔ ریٹائرمنٹ سے لے کر وفات کے وقت تک وہ پرائیویٹ پریکٹس کرتے رہے۔

دہلی میں کچھ عرصے پہلے تک ایسے بزرگ موجود تھے جنھوں نے کرنل ذوالنور کو دیکھا تھا۔ ان بزرگوں کا کہنا تھا کہ ذوالنور احمد صاحب کا شمار ہندوستان کے بہترین ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ ایک بزرگ تھے صلاح الدین حسن کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہوا ہے، وہ میری موجودگی میں فخر الدین صاحب کو بتا رہے تھے کہ وہ اور ان کے خاندان کے لوگ کرنل ذوالنور احمد صاحب کے زیر علاج رہے ہیں۔ صلاح الدین صاحب کہتے تھے کہ ہم کرنل صاحب کو مسیحا کہا کرتے تھے اور یہ نام ان کا خاصا مشہور ہو گیا تھا لیکن جب کچھ چالاک لوگوں نے انھیں ڈاکٹر مسیحا کہنا شروع کر دیا تو دہلی والوں نے انھیں کرنل صاحب ہی کہنا مناسب سمجھا۔ کرنل ذوالنور احمد نے آخری عمر (نومبر ۱۹۰۰ء) میں شادی کی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً اکیاون سال تھی۔ انھوں نے مرزا باقر علی خاں کامل کی سب سے چھوٹی صاحبزادی رقیہ سلطان بیگم سے کی تھی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ دونوں حمیدہ آپا کے والدین تھے۔ آپا کے بڑے بھائی فخر الدین علی احمد کو قومی خدمات کے سلسلے میں قوم نے صدر جمہوریہ ہند کے بلند ترین عہدے پر فائز کیا۔ فخر الدین صاحب کی بیوی بیگم عابدہ احمد بفضل تعالیٰ حیات ہیں اور غالب انسٹی ٹیوٹ کی چیرمین کی حیثیت سے اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں۔

حمیدہ آپا نے نہ صرف اردو زبان اور ادب کی ترقی کے لیے عملی طور پر جد و جہد کی بلکہ خود بھی دو ناول لکھے۔ ان کے پہلے ناول کا نام ہے "ثروت آرا بیگم" اور دوسرے ناول کا نام ہے "رنگ گل"۔ آپا کی ذہنی تربیت میں ان کے خاندان کے علمی اور ادبی ماحول نے بہت نمایاں رول ادا کیا۔ آپا کہتی تھیں کہ ایک زمانے میں بلا مبالغہ سیکڑوں اور بے شمار کہانیاں پڑھی تھیں۔ اس کی وجہ سے آپا کو ناول لکھنے کی تکنیک سے بھرپور واقفیت حاصل ہو گئی۔ آپا نے اپنا پہلا ناول "ثروت آرا بیگم" اس وقت لکھا تھا جب ان کی عمر بیس یا اکیس سال تھی اور آٹھ دس سال بعد اس ناول کو شائع کرنے کی نوبت آئی تھی۔

آپا کا دوسرا ناول "رنگ گل" ہے جو بہت دل چسپ ہے۔ ان کے دونوں ناولوں میں دہلی کے متمول خاندان کی سماجی زندگی کی عکاسی بہت خوب صورت انداز میں کی گئی ہے۔ یہ دونوں ناول اب نایاب ہیں۔

حمیدہ آپا نے ایک اہم علمی کام کر کے غالب کے خاندان سے ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے لوہارو خاندان کے شعرا پر ایک کتاب لکھی ہے جو تحقیقی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں لوہارو خاندان کے حالات حمیدہ آپا نے بڑے مستند انداز میں پیش کیے ہیں۔ میں نے اس کتاب کا کئی بار بغور مطالعہ کیا ہے اور ابھی تک مجھے اس میں کوئی تحقیقی غلطی نہیں دکھائی دی۔ یہ کتاب ایک طرف تو لوہارو خاندان کی تاریخ ہے اور دوسری طرف غالب کے متعلقین اور ان کے شاگردوں کے حالات پیش کرتی ہے اس لیے غالبیات میں اس کتاب کو اہم اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ آپا نے خاصی تعداد میں افسانے بھی لکھے تھے جو ہندوستان کے مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔ ان افسانوں کا ایک انتخاب "شگوفہ" کے نام سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ آپا کی آخری تخلیق "بہار و خزاں" ہے۔ یہ بہت دل چسپ اور سماجی ناول ہے جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔

آپا کو مختلف کتابوں پر ساہتیہ کلا پریشد (دہلی)، دہلی اردو اکیڈمی اور اتر پردیش اردو اکیڈمی سے انعامات ملے، جنھیں انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک حکومت اردو کو اس کا جائز حق نہیں دے گی، میں اس طرح کا کوئی انعام قبول نہیں کروں گی۔ کچھ سال پہلے آپا زین العابدین خاں عارف مرتب کرنا چاہتی تھیں، انھوں نے اس سلسلے میں کچھ بنیادی کام بھی کیا تھا لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ کام آگے نہیں بڑھ سکا۔

حمیدہ آپا ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے اعلا خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے وہ انتہائی شریف، مہذب، دیانت دار اور خدا ترس تھیں۔ بس اتنی بات ہے کہ ان کے مزاج میں ذرا تیزی تھی، بہت جلد غصہ ہو جاتی تھیں اور یہی ان کے کمزور پن کی دلیل بھی ہے، اسی لیے وہ جلد ہی سب کچھ بھول کر معاف بھی کر دیتی تھیں۔ مجھ پر کئی بار ناراض ہوئیں اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ اب وہ زندگی بھر مجھ سے بات نہیں کریں گی لیکن چند روز بعد جب ان سے ملاقات ہوئی تو محسوس ہوا کہ پچھلی بات بالکل ہی بھول چکی تھیں اور ایسی کتنی ہی پچھلی باتیں وہ اگلی ملاقاتوں میں بھول چکی ہوتی تھیں۔ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ وہ ایک تو اس رشتے سے کہ میں ان کا خورد ہوں اور دلّی والا ہوں اور دوسرے اس لیے بھی کہ وہ علی منزل ٹرسٹ اور انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کی سکریٹری تھیں۔ وہ عمر اور مرتبے دونوں میں مجھ سے بہت بڑی تھیں اس کے باوجود انھوں نے مجھے ان دونوں اداروں کا صدر بنوایا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اردو دُنیا

انجمن ترقی اردو شاخ ریوا (مدھیہ پردیش) کے انتخابات

ریوا (ڈاک سے)۔ انجمن ترقی اردو شاخ ریوا (مدھیہ پردیش) کے انتخابات صوبائی انجمن کے سکریٹری جناب لال وکرم جیت سنگھ کی صدارت میں منعقد ہوئے جس میں متفقہ طور پر لال وکرم جیت سنگھ کو ریوا شاخ کا صدر منتخب کر لیا گیا جب کہ ممتاز شاعر ظہور منصوری نگاہ کو دوبارہ سکریٹری منتخب کیا گیا۔ مختلف عہدیداران اور اراکین مجلس عاملہ کے نام درج ذیل ہیں:

صدر: لال وکرم جیت سنگھ صاحب
نائب صدر: مظفر حسین نظامی صاحب اور جمیل احمد صاحب
سکریٹری: ظہور منصوری نگاہ صاحب
نائب سکریٹری: منیش کمار مالویہ صاحب
سکریٹری نشر و اشاعت: حشمت ریوانی صاحب
خازن: اطہر احمد صاحب
اراکین مجلس عاملہ: ڈاکٹر عبدالسلام، یوگیش کمار شریواستو صاحب، شوق ریوانی صاحب، جام ریوانی صاحب، آدتیہ پرتاپ سنگھ صاحب۔

صوبائی انجمن کے صدر پروفیسر آفاق احمد نے ریوا شاخ کے عہدیداران اور اراکین مجلس عاملہ کو ان کے انتخاب پر مبارک باد دیتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے مصروف عمل رہیں گے۔ انھوں نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ لال وکرم جیت سنگھ کی قیادت میں انجمن کے ذریعے اردو کے مسائل ضرور حل ہوں گے۔ خصوصاً اردو تعلیم اور درس گاہوں میں اردو اساتذہ کا تقرر اور عوامی سطح پر اردو کا استعمال سرکار کے ذریعے عمل میں آئے گا۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انجمن ترقی اردو ریوا کی اپنی لائبریری بھی ہے جس میں وافر تعداد میں اردو کتب تشنگان ادب کی پیاس بجھانے کو موجود ہیں۔
(پریس ریلیز انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش)

اردو ڈائرکٹوریٹ کے قیام میں افسران شاہی کی رکاوٹ دور ہونے کی توقع
روشن بیگ کی قیادت میں وزیر اعلا سے کرناٹا وفد کی ملاقات

بنگلور (۱۲ فروری)۔ ریاستی وزیر اعلا ایس ایم کرشنا نے کئی ماہ پہلے ہی ریاست کرناٹک میں علاحدہ اردو ڈائرکٹوریٹ کے قیام کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بعد جناب اوحدی سلیم کو اس ڈائرکٹوریٹ کا ڈائرکٹر بھی مقرر کیا گیا تھا مگر افسران شاہی نے اس میں رکاوٹ پیدا کر رکھی تھی۔ ذرائع کے مطابق اردو ڈائرکٹوریٹ کے لیے ضروری بنیادی ڈھانچہ اور اسٹاف وغیرہ کی سہولت مہیا کرنے میں وزیر اعلا کی ہدایت کے باوجود تنگ نظر افسران شاہی نے رکاوٹ پیدا کر رکھی تھی۔ کل شہر میں منعقد کرناٹک راجیہ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جنرل باڈی اجلاس میں اردو ڈائرکٹوریٹ کے معاملے پر سنجیدہ غور کرنے کے بعد آج شام کرناٹا کے عہدیداروں نے ریاستی وزیر برائے چھوٹی صنعت و حج جناب آر روشن بیگ کی قیادت میں ریاستی وزیر اعلا ایس ایم کرشنا سے ملاقات کر کے ان کی اس معاملے کی طرف جب توجہ دلائی تو مسٹر کرشنا نے پرنسپل سکریٹری برائے ناکاکس جناب چرنجیو سنگھ کو طلب کر کے اردو ڈائرکٹوریٹ کے بنیادی ڈھانچے کے قیام کے لیے اقدامات کرنے کی ہدایت دی۔ اس موقع پر وزیر اعلا کی موجودگی میں مسٹر سنگھ نے کرناٹا کے وفد اور جناب روشن بیگ کو یہ یقین دلایا ہے کہ یہ فائل ان کے پاس تیار پڑا ہے اور کل ہی وہ اردو اسکولوں کے تمام معاملات کو اردو ڈائرکٹوریٹ کو منتقل کر دیں گے۔ فی الحال اردو ڈائرکٹوریٹ کا دفتر کمشنر برائے تعلیمات عامہ کے دفتر میں موجود ہے۔ اس دفتر کے بالکل بازو میں ایک نئی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اگر مسلم وزراء اس طرف توجہ دے کر وزیر اعلا کو سمجھائیں تو وزیر اعلا ضرور اس درخواست پر منظوری دے دیں گے۔ جناب روشن بیگ نے 'سالار' کو بتایا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کے سلسلے میں کرناٹا وفد اور انھوں نے آج صبح ریاستی وزیر برائے پرائمری اور سیکنڈری تعلیم پروفیسر بی کے چندر شیکھر سے ملاقات کی۔ جناب چندر شیکھر نے بھی یہ یقین دلایا ہے کہ ایک بااختیار اور مکمل اردو ڈائرکٹوریٹ کے سلسلے میں وہ بھرپور تعاون دیں گے۔ جناب روشن بیگ نے کہا کہ سرکاری ہائی اسکولوں میں اردو منشیوں کے خالی عہدے پر کرنے کے سلسلے میں وہ متعلقہ حکام سے بات چیت کریں گے۔ وزیر اعلا اور وزیر تعلیم سے ملنے والے کرناٹا وفد میں صدر کرناٹا جناب چاند پاشا، جنرل سکریٹری جناب فیض اللہ بیگ جنیدی کے علاوہ دیگر عہدیداران، اراکین اور کرناٹا کی ضلعی شاخوں کے عہدیداران بھی شامل تھے۔
(سالار۔ بنگلور)

اردو عربی مدرسوں کو گرانٹس جاری کرنے کی گزارش

بنگلور۔ کرناٹک اسٹیٹ اردو اور عربک اسکول انتظامیہ اور ملازمین فیڈریشن بیجاپور کے کنوینر جے ڈی چودھری نے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کی جانب سے ۱۹۸۷ تا ۱۹۹۲ء میں شروع کردہ تعلیمی اداروں کے لیے تنخواہ گرانٹس کو منظوری دینے کے سلسلے میں حکومت کے فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے اور حکومت سے گزارش کی ہے کہ اقلیتی طبقات کی جانب سے چلائے جا رہے تعلیمی اداروں بالخصوص اردو اور عربی مدرسوں کے لیے بھی فوری طور پر تنخواہ گرانٹس کو منظوری دی جائے۔
(سالار۔ بنگلور)

ہر ریلوے اسٹیشن پر اردو تحریر کرنے کا مطالبہ

حیدرآباد۔ ڈویژنل ریلوے یوزرس مشاورتی کمیٹی حیدرآباد (ساؤتھ سنٹرل ریلوے) کی رکن محترمہ حمیرہ عزیز نے سکندرآباد آفس میں منعقدہ کمیٹی کے اجلاس میں اظہار خیال کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ ہر ریلوے اسٹیشن پر اردو زبان تحریر کروائی جائے اور مسافروں کی سہولت کے لیے شہر کے دور دراز علاقوں چندرائن گٹہ اور ٹولی چوکی میں ریلوے ریزرویشن کاؤنٹرس قائم کیے جائیں۔ اجلاس کی صدارت چیرمین کمیٹی جناب رنجیت کوسلا نے کی اور سکریٹری کمیٹی جناب گوئنڈیا نے ارکان کو ایجنڈہ سے واقف کروایا۔ حمیرہ عزیز صاحبہ نے کہا کہ ریلوے کو ہمیشہ مسافروں کی سہولت کا جائزہ لینا چاہیے اور اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ ریلوے اسٹیشن پر اردو زبان تحریر کروانے سے ریلوے کو کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ مسافروں کو اسٹیشن اور اپنی منزل مقصود کی شناخت ہوگی۔
(سیاست۔ حیدرآباد)

آر ٹی سی بسوں پر اردو ناموں کی تحریر کا مطالبہ

جگتیال۔ جناب محمد شریف الدین اسسٹنٹ جوائنٹ سکریٹری ٹی آر ایس نے ضلع کریم نگر کے بسوں کے سائن بورڈ پر مقامات کے نام اردو میں تحریر نہ کیے جانے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ حکومت اردو کے تعلق سے اعلانات کرتی ہے اور عمل ندارد ہے۔
(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

ڈاکٹر شہناز شفیع کی کتاب ''شمالی بندیل کھنڈ کے اہم شعرا کے کلام کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ'' کی رسم رونمائی

بھوپال (ڈاک سے)۔ علامہ اقبال اردو مرکز کے سکریٹری اور انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کے صدر پروفیسر آفاق احمد نے ڈاکٹر شہناز شفیع کی کتاب ''شمالی بندیل کھنڈ کے اہم شعرا کے کلام کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ'' کی رسم رونمائی انجام دی۔

اس موقع پر سمینار اور مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا۔ سمینار میں ڈاکٹر عثمان انصاری، ڈاکٹر جلیل الرحمن، محترمہ شبنم سحر، پروفیسر محمد شکیل شفیع، جناب قیصر جمال اور جناب دیبے بہادر سنگھ نے اپنے مقالے پیش کر کے اس کتاب کی خصوصیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شمالی بندیل کھنڈ کے شعرا کے سلسلے میں اتنی اہم کتاب آج تک پیش نہیں کی گئی ہے۔ اس میں جھانسی، مہوبا، باندہ، ہمیر پور، للت پور اور جالون ضلع کے تمام شعرا کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مرزا غالب، پریم چند، آغا حشر کاشمیری، منیر شکوہ آبادی وغیرہ کی بندیل کھنڈ آمد اور ان کی خدمات کا ذکر بہت ہی اہم ہے۔

پروفیسر محمد شفیع نے کہا کہ دراصل یہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا جانے والا مقالہ ہے جو میری نگرانی میں لکھا گیا اور ساگر یونیورسٹی نے اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے اور اسی یونیورسٹی کی مدد سے یہ شائع بھی ہوا ہے۔ یہ مقالہ اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ اس میں بندیل کھنڈ کی ادبی تاریخ پہلی بار پیش کی گئی ہے۔

پروفیسر آفاق احمد نے کہا کہ یہ کتاب اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ علاقائی ادب پر گہرائی سے کام ہونا چاہیے۔ بندیل کھنڈ کے شعرا پر یہ بھرپور کتاب ہے اور اس میں بہت محنت کی گئی ہے۔

شب میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر آفاق احمد نے فرمائی۔ نظامت ڈاکٹر جلیل الرحمن انصاری نے کی۔

پروفیسر ایس اے وہاب
اردو یونیورسٹی کے انچارج وائس چانسلر

حیدرآباد (۹ فروری)۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پروفیسر ایس اے وہاب (وہاب قیصر) نے کل یونیورسٹی کے انچارج وائس چانسلر کی حیثیت سے عہدہ سنبھال لیا ہے۔ محمد شمیم جیراجپوری نے حکومت ہند کی وزارت فروغ انسانی وسائل کی ہدایت کے مطابق پروفیسر وہاب کو اس عہدے کا چارج سونپا ہے۔

سائنس کے استاد، اردو کے ادیب اور ممتاز کالج حیدرآباد کے سابق پرنسپل ڈاکٹر ایس اے وہاب نے ۲۰ مارچ ۲۰۰۲ء کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں کنٹرولر آف ایگزامنیشن کی حیثیت سے جوائن کیا تھا۔ انھیں ڈائرکٹر ڈسٹنس ایجوکیشن کی اضافی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ حال ہی میں انھیں ڈائرکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن میں پروفیسر کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا اور اسی حیثیت سے انھیں وائس چانسلر شپ کا چارج دیا گیا ہے۔ وہ مرکزی حکومت کی جانب سے مستقل وائس چانسلر کی تقرری تک اس عہدے کے فرائض انجام دیں گے۔
(ڈاکٹر ظفر الدین)

اردو کے فروغ سے متعلق جاری رقم کا صحیح استعمال ناگزیر

نلومس۔ اے پی اسٹیٹ مائناریٹی ویمنس ڈیولپمنٹ ایسوسی ایشن کی جنرل سکریٹری محترمہ فریدہ سلطانہ اور نائب صدر محترمہ ملکہ بیگم نے اپنے مشترکہ صحافتی بیان میں چیف منسٹر جناب این چندرا بابو نائیڈو سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ مرکزی حکومت کی طرف سے ریاست آندھرا پردیش میں اردو زبان کے فروغ اور تحفظ کے لیے جاری کردہ رقم تین کروڑ روپے کو صحیح مصرف میں لانے کے لیے ایسوسی ایشن کے قائدین نے اپنی طرف سے پیش کردہ تفصیلی تجاویز میں اس رقم کو مساوی تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ادارہ سیاست، اردو اکیڈمی کے علاوہ اقلیتی فینانس کارپوریشن آندھرا پردیش کے زیر نگرانی مسلم خواتین کی فعال تنظیموں کو جاری کرنے کی خواہش کی۔ ایسوسی ایشن کے قائدین نے مدرسہ عالیہ اور محبوبیہ کو ادارہ سیاست کے حوالے کرنے کے ریاستی حکومت کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے چیف منسٹر جناب این چندرا بابو نائیڈو کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے کہا کہ عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر انتظام ادارہ سیاست انگریزی و تلگو زبانوں میں زیر تعلیم طلبہ کے لیے اردو سکھانے کے لیے ریاست بھر میں اپنے مراکز قائم کرتے ہوئے اردو زبان کی ترقی کے لیے سرگرم عمل ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

جشن سیّد حامد کمیٹی کی سرگرمیاں

نئی دہلی۔ جناب سیّد حامد (چانسلر ہمدرد یونیورسٹی نئی دہلی) دور حاضر کے مسلم مفکرین اور دانشوروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ پچھلی نصف صدی سے موصوف نے ہندوستان میں مسلم معاشرے کی اصلاح اور اس کی ترقی کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ نہایت وقیع اور گراں قدر ہیں۔ ان کی خدمات کا قومی سطح پر اعتراف کرنے اور ان کے بصیرت افروز مضامین ومقالات کو جو مسلم معاشرے اور زبان وتہذیب کے مختلف موضوعات سے متعلق ہیں، یکجا کرکے شایانِ شان انداز میں منظر عام پر لانے کے مقصد کے تحت کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور جناب ابوالفیض سحر پر مشتمل ایک جشن سیّد حامد کمیٹی تشکیل پائی تھی۔ اس کمیٹی نے اب تک سیّد حامد کی چار تازہ تصانیف (۱) شیرازہ (مجموعۂ کلام) (۲) روشنی کے مینار [خاکوں کا مجموعہ] (۳) مضامین سیّد حامد [جلد اول] اور (۴) مضامین سیّد حامد، جلد دوم [مقالات کے مجموعے] مرتب کرکے شائع کردی ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت میں مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے صدر محترم عزیز قریشی نے خصوصی تعاون دیا ہے۔ ان کے علاوہ حامد صاحب کے بعض قدر دانوں اور کچھ اداروں کا بھی تعاون حاصل رہا ہے۔

(منصف۔ حیدرآباد)

اک دیا اور بجھا

نئی دہلی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں صدر شعبۂ عربی پروفیسر سیّد ضیاء الحسن ندوی کا ۲۰رجنوری ۲۰۰۳ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۵۸ برس تھی۔ پس ماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹی اور تین بیٹے ہیں۔ پروفیسر ندوی جامعہ کی ہم منصبیر اور انڈو عرب ثقافتی کے ذہین اور ہندوستانی کاؤنسل برائے ثقافتی تعلقات ICCR کے سہ ماہی جریدہ "ثقافت الہند" کے مدیر بھی تھے۔ انھوں نے مصر، تیونس، مراقش اور انڈونیشیا سمیت متعدد ملکوں میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔

ادارہ "ہماری زبان" مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

عادل آباد میں اردو اساتذہ کے تقررات میں تاخیر

ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن سے نمائندگی

حیدرآباد۔ اسٹیٹ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن شاخ عادل آباد کے ایک وفد نے جناب محمد عبدالعظیم (ریاستی جنرل سکریٹری) کی قیادت میں کمشنر ڈائرکٹر آف اسکول ایجوکیشن سے ملاقات کی اور ضلع عادل آباد میں روسٹر سسٹم کی برخاستگی کے بعد اردو کے مدرسین کے تقررات اور نتائج کے اعلان میں صدر نشین اور ڈی ای او عادل آباد کی جانب سے تاخیر کی طرف توجہ مبذول کروائی کیوں کہ دیگر اضلاع میں روسٹر سسٹم کی برخاستگی کے بعد اردو کے مدرسین کے تقررات ہوچکے ہیں۔ کمشنر ڈائرکٹر آف اسکول ایجوکیشن نے یقین دلایا کہ ایک ہفتہ کے اندر اردو مدرسین کے تقررات اور نتائج کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔

(منصف۔ حیدرآباد)

حیدرآباد میں پروفیسر مظفر حنفی اور ڈاکٹر محبوب راہی کی آمد پر جلسہ اور مشاعرہ

پروفیسر مظفر حنفی، ڈاکٹر محبوب راہی اور ان کے احباب قاضی حسن رضا اور پرنسپل حبیب عالم کے حیدرآباد پہنچنے پر دو ادبی جلسے اور مشاعرے منعقد کیے گئے۔ پہلا جلسہ "حلقہ" (حیدرآباد لٹریری فاؤنڈیشن) کے زیر اہتمام اردو ہال حمایت نگر میں 'حلقہ' کے نوتخب صدر جناب غیاث حسین کی صدارت میں منعقد ہوا جس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر بیگ احساس نے انجام دیے۔ مظفر حنفی اور محبوب راہی کے علاوہ غیاث حسین، مصحف اقبال توصیفی، محسن جلگانوی، محمد بن حسین، آغا سروش، رؤف خلش، تسنیم جوہر، عزیز حسین عزیز، رشید شہیدی، علی ظہیر، علی فرید وغیرہ نے اپنی منتخب شعری نگارشات پیش کیں۔ دوسرا جلسہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ اردو و فارسی کے زیر اہتمام یونیورسٹی کے ثقافتی ہال میں منعقد کیا گیا۔ صدارت ڈاکٹر رحمت یوسف زئی نے اور نظامت ڈاکٹر نسیم الدین نے فرمائی۔ پروفیسر مظفر حنفی، ڈاکٹر محبوب راہی، قاضی حسن رضا اور پرنسپل حبیب عالم نے شعری تخلیقات کے علاوہ علم، ادب اور ثقافت کے موضوعات پر اپنے خیالات بھی پیش کیے۔

(ساجد انور خاں)

جنم بھومی پروگرام میں اقلیتیں اور اردو نظر انداز

حیدرآباد۔ راشٹریہ مسلم الائنس کے صدر جناب مرزا فاروق بیگ نے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ جنم بھومی پروگرام کے تحت اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے بھی فلاحی اسکیمات کو نافذ کرے۔ انھوں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ جنم بھومی کے اٹھارویں مرحلے میں اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں، مسلم علاقوں اور اردو کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ دونوں شہروں کے سرکاری اردو تعلیمی اداروں کی کارکردگی اور اس کے نتائج سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں اور یہ مدارس ایک عرصہ سے کئی ایک مسائل کے شکار ہیں اس کے باوجود بھی ان اداروں کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے خاطر خواہ توجہ نہیں دی جارہی ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

بیگم حمیدہ سلطان احمد کی وفات پر انجمن ترقی اردو (ہند) کا تعزیتی جلسہ

علمی، ادبی جلسوں اور تحریکوں کی سرگرم شخصیت بیگم حمیدہ سلطان احمد کے انتقال پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر اردو گھر میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں ۲۰رجنوری ۲۰۰۳ء کو تعزیتی جلسے کا انعقاد ہوا۔

جلسے میں جناب ابوالفیض سحر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی سماج یا قوم کی تہذیب، اس کی زبان اور اس کے ادب کی بقا اور ترقی میں خواتین کا بھی بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ حمیدہ سلطان صاحبہ کا کردار اس حقیقت کی ایک روشن مثال ہے۔ انھوں نے اردو تحریک سے جڑ کر اردو زبان و ادب اور تہذیب کی بقا اور اس کے ہمہ گیر وہمہ جہت فروغ کے لیے اپنی زندگی گویا وقف کردی تھی۔ وہ ہماری گراں قدر تہذیبی روایات اور اخلاقی اقدار کی پاسباں اور امین تھیں۔ یقین ہے کہ دہلی کی ادبی وتہذیبی تاریخ میں ان کی تاریخ ساز خدمات ہمیشہ محفوظ رہیں گی اور انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہے گا۔

جناب شاہد ماہلی نے مرحومہ کی اردو زبان وادب کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حمیدہ سلطان صاحبہ دہلی کی ممتاز اور سینئر ادیبہ اور زبان داں تھیں۔ ان کی ادبی خدمات کا درخشاں دور نصف صدی سے زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے دہلی میں اردو زبان اور اس کے ادب کی ترقی اور تحفظ کے لیے انجمن ترقی اردو (دہلی) کی جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بہت قابل قدر خدمات انجام دیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں ان کا اہم رول رہا ہے۔ ان کے انتقال سے دہلی میں اردو زبان و ادب کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا ہے۔

قسیم جہاں صاحبہ نے کہا کہ حمیدہ آپا ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو اپنے آپ میں ایک انجمن تھیں۔ ان کے انتقال سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ ایک تاریخی شخصیت تھیں۔ ایک قلم کار کی حیثیت سے انھوں نے اردو زبان وادب میں اہم اضافے کیے۔ "خاندان لوہارو کے شعرا" (تحقیق)، "رنگ گل" (ناول)، "ہیلو" (افسانوں کا مجموعہ) ان کی قابل ذکر تصانیف ہیں۔ انھوں نے تقریباً چالیس سال تک انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہے گی۔ خدا ان کو بلند مقام عطا فرمائے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے مرزا غالب کے ساتھ بیگم حمیدہ سلطان احمد کے خاندانی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ حمیدہ سلطان احمد دہلوی تہذیب کا اعلا نمونہ تھیں۔ غالب سے ان کا تعلق یہ تھا کہ غالب نے اپنی بیوی کی بہن کے ایک صاحبزادے زین العابدین خاں عارف کو گود لے لیا تھا۔ عارف کے دو لڑکے تھے حسین علی خاں اور باقر علی خاں۔ باقر کی تیسری اور سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں رقیہ بیگم۔ حمیدہ آپا ان ہی کی صاحبزادی تھیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے مزید کہا کہ حمیدہ آپا کو اردو زبان اور ادب سے غیر معمولی محبت تھی۔ پچھلے پچاس سال سے وہ ایک مجاہد کی طرح اردو کی خدمت کررہی تھیں۔ تقریباً چالیس سال تک وہ غالب کے مزار پر ایک شاندار تعزیتی جلسہ منعقد کرتی رہیں۔

آخر میں جلسے کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے بیگم حمیدہ سلطان کے انتقال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا حمیدہ آپا کا انتقال دہلی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا ایک بڑا حادثہ ہے۔ وہ تمام عمر اردو تحریک کا ایک ستون رہیں۔ اُن کے ناول اور افسانے اپنے زمانے میں بہت مقبول رہے۔ ان کی شخصیت میں دہلی کے اس تہذیبی ورثے کی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں جو وقت کے ساتھ اب معدوم ہوتی ہوئی گئی ہیں۔ ان کی تحریروں میں بھی ان کی شخصیت اور گرد وپیش کے تجربات کا گہرا اثر ملتا ہے۔ ان کی وفات میرے لیے ایک ذاتی حادثہ بھی ہے۔ ان کی شفقت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

جلسے کے آخر میں تعزیتی قرارداد پاس کی گئی اور دو منٹ کی خاموشی کے بعد جلسے کا اختتام ہوا۔

(ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب: محمد احمد سبزواری، فن اور شخصیت
مصنفہ: ڈاکٹر رضیہ حامد
ضخامت: ۱۹۲ صفحات
قیمت: ۵۰۰ روپے
پبلشر: باب العلم پبلی کیشنز ۶-کنارا اپارٹمنٹ، وی آئی پی روڈ بھوپال-۴۶۲۰۰۱
تبصرہ نگار: رفعت سروش

ڈاکٹر رضیہ حامد بنیادی طور پر تحقیقی مزاج رکھتی ہیں۔ ان کی پہلی تصنیف "نواب صدیق حسن خاں" ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ موصوف اپنے دور کی حکمران ریاست بھوپال کے وزیر بھی تھے اور شوہر بھی۔ وہ عربی کے تبحر عالم تھے۔ رضیہ حامد نے نواب صدیق حسن خاں کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اپنی ژرف نگاہی کی بدولت اس طرح واضح کیا کہ ان کی یہ کتاب حوالے کی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ اس تحقیقی کارنامے کے بعد موصوفہ کا جوادبی کام بحیثیت اڈیٹر 'فکر و آگہی' کے سامنے آیا اس میں چند معاصرین پر خصوصی نمبر اور ان کے علاوہ بھوپال نمبر اور علی گڑھ نمبر قابل ذکر ہیں۔ آخرالذکر دونوں نمبر ان کے محققانہ مزاج کا اعلا نمونے ہیں۔ خصوصاً بھوپال نمبر جس میں ڈاکٹر رضیہ حامد نے بھوپال کو گلیوں، محلوں، تالابوں کے کناروں اور سرسبز پہاڑیوں سے چن چن کر صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر کردیا ہے۔ اپنے وطن مولود سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرکے انھیں روحی طمانیت ملی ہوگی۔

اب بنیادی طور پر بھوپال سے متعلق ہی ان کا نیا تحقیقی کارنامہ سامنے آیا ہے۔ بھوپال کے ایک فرزند محمد احمد سبزواری سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے مصنفہ نے ان کے کام کو دنیا کے کونے کونے سے سمیٹ کر اس کتاب کی تعمیر کی ہے۔ سبزواری صاحب کے خاندانی حالات کا ذکر کرتے ہوئے رضیہ حامد نے لکھا ہے کہ ان کے اجداد مغل شہنشاہوں کے دور حکومت میں سبزوار (ایران) سے ہندوستان آئے اور یوپی کے مغربی اضلاع میں آباد ہوئے۔ مصنفہ کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق جامع مسجد (دہلی) کے صدر دروازے کے سامنے سرمد شہید کے سرخ رنگ کے مزار کے ساتھ سبز رنگ کا مزار ابوالقاسم سبزواری کا ہے جو عرف عام میں ہرے بھرے کا مزار کہلاتا ہے۔ سبزواری خاندان کی ایک شاخ میرٹھ میں بھی آباد ہے۔ مولانا شوکت علی سبزواری اس خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے راقم الحروف نے ان کو دیکھا ہے، عظمت اسلام اور ختم نبوت کے موضوع پر ان کی تقریریں سنی ہیں۔ وہ قادیانیوں کے خلاف ایک زبردست مناظر کے طور پر ابھرے تھے اور تقسیم کے بعد پاکستان میں اعلا علمی و تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ محمد احمد سبزواری اسی خاندان کے روشن چراغ ہیں جو آج کراچی میں اپنی روشنی سے علم و ادب کی دنیا میں اجالا بکھیر رہے ہیں۔ سبزواری صاحب ۲۶ جنوری ۱۹۱۳ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے اور رضیہ حامد نے یہ کتاب ان کے ۹۰ویں جشن سالگرہ پر ان کو اور اہل علم کو تحفہ دینے کے لیے لکھی ہے۔

رضیہ حامد نے 'پس منظر' کے عنوان سے ابتدا میں جو باب سپرد قلم کیا ہے وہ اس ماحول کی بھرپور عکاسی کرتا ہے جو سبزواری صاحب کو ورثے میں ملا۔ یہ باب رواں دواں انداز میں اختصار کے ساتھ بھوپال کی تاریخ ہے۔ محمد احمد سبزواری نے اگرچہ اردو میں مضمون نگاری کا آغاز ۱۹۳۱ء سے ہی کردیا تھا مگر ان کا اصل کام زندگی کے ایک اہم شعبے سے منسلک ہے اور وہ ہے "بینک کاری"۔ اور یہی موضوع تھا جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) میں ان کے تحقیقی مقالے کا۔ "ریاست حیدرآباد کا نظام زر اور بینک کاری"۔ بہ وجوہ ان کا یہ تحقیقی مقالہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ بھوپال سے زندگی انھیں کہاں کہاں لے گئی۔ اورنگ آباد، حیدرآباد، واشنگٹن اور مختلف علمی اور تعلیمی اداروں میں جہاں ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا موضوع معاشیات سے ہی متعلق رہا۔ اور انھوں نے بینکنگ کے علاوہ "ساجی اعداد و شمار" جیسے اہم شعبے میں مہارت حاصل کی ہے اور امریکہ کے ادارے سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کی اس کتاب کے ذریعے ہم سبزواری صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خصوصی شعبۂ علم سے متعلق پاکستان میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ اور جہاں رہے نمایاں خدمات انجام دیں۔

سبزواری صاحب کی مطبوعہ تصنیفات صرف پانچ ہیں۔ ان کی اہمیت میرے نزدیک یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں (مرثیہ، نظم، غزل اور افسانہ، ناول، تنقید) کے علاوہ لکھا ہے۔ ذکر وائینز عشرۃ (انگریزی)، گلوسری آف اسلامک اکنامکس ٹرمس، اسلام میں بچت کا تصور، اصطلاحات بینک کاری، (گیارہ ہزار صفحات پر مشتمل) اور اصطلاحات عمرانیات۔ البتہ ان کی خود نوشت رسالہ 'افکار' میں ایک سال تک قسط وار چھپی ہے (کتابی شکل میں نہیں آئی)۔

اردو زبان و ادب سے چوں کہ سبزواری صاحب کو بچپن سے لگاؤ رہا ہے اس لیے اب ان کی تحریریں گزشتہ دو سال سے ماہنامہ 'افکار' میں تبصروں کی صورت میں نظر آنے لگی ہیں۔ اس کے علاوہ بحیثیت سبزواری صاحب کی سوانح نگار کے رضیہ حامد نے ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کی ایک فہرست فراہم کی ہے جو سب بھوپال کی تاریخ اور ثقافت سے متعلق ہیں۔ مصنفہ نے ان کتابوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جن پر سبزواری صاحب نے مقدمات لکھے ہیں۔ غرض کوئی گوشہ چھوڑا نہیں ہے۔

مجموعی طور پر یہ عرض کرنا بے جا نہیں کہ رضیہ حامد کی طرح ہی محمد احمد سبزواری بھی عاشق بھوپال ہیں اور ان کی اس محبت کو رضیہ حامد نے یہ سوانح قلم بند کرکے اعتبار و استناد کا درجہ دے دیا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کو اپنے اس تحقیقی کارنامے کی داد ملنی چاہیے۔ وہ ڈاکٹر آف لٹریچر تو ہیں ہی، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال یا کراچی یونیورسٹی کو انھیں کوئی خصوصی اعزاز ضرور دینا چاہیے۔

یہ کتاب معنوی محاسن کے ساتھ صوری حسن سے بھی لبریز ہے۔ خوب صورت جلد، چکنا سفید دبیز کاغذ اور شفاف کمپوزنگ۔ کیا اچھا ہو اگر اہل ذوق اس کتاب کو خرید کر پڑھیں اور اپنی ذاتی لائبریری میں محفوظ رکھیں۔

☆☆☆

نام کتاب: خاقانی شروانی حیات و شاعری
مصنف: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
ضخامت: ۱۷۰ صفحات
قیمت: ۱۰۰ روپے
ناشر: علیم پرنٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور-۴۴۰۰۱۸
تبصرہ نگار: ڈاکٹر سید معصوم رضا

اردو میں کلاسیکی ادب کی تحقیق کا سلسلہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جارہا ہے، اس پر بھی فارسی کلاسیکی شعرا کے فن پر تحقیقی کام تو اب نہیں کے برابر ہی ہو رہا ہے۔ پھر بھی چند حضرات آج بھی اپنی تحقیقی کاوشوں کی وجہ سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کا نام ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل ہے۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل کی کئی کتابیں منظر عام پر آکر داد تحسین قبول کر چکی ہیں۔ وہ بہ یک وقت تاریخ، تحقیق، تنقید و تخریج، شاعری اور صحافت سے وابستہ ہیں۔ جس سے ان کی ہمہ جہت شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل کو اردو، فارسی اور عربی زبان و ادب سے دلچسپی بھی ہے اور عبور بھی حاصل ہے۔ فارسی زبان و ادب سے ان کی دلچسپی کا ثبوت یہ ہے کہ زیر تبصرہ کتاب "خاقانی شروانی- حیات و شاعری" ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی تیسری تخلیق ہے۔ یہ کتاب ۲۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں "خاقانی شروانی- حیات و شاعری" کے حوالے سے چار ذیلی عنوانات میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا باب حالات و کوائف کے عنوان سے ہے۔ جس میں خاقانی شروانی کے عہد، خاندان، تعلیم، لقب، کنیت، جائے ولادت، شاعری کی شروعات، شادی، خراسان کا سفر، مکہ معظمہ کی زیارت، عادات و اخلاق، مسلک اور تصانیف کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ دوسرے باب "شاعری" میں قصیدہ نگاری، شاعری کی ادبی خصوصیات، رجزیت، رمز و کنایہ، تشبیہ و استعارہ، تلمیح، علمی اصطلاحات، قرآن و حدیث کے اشارے اور دیگر علم و ہنر کے علاوہ کلاسیکیت، منظر کشی اور رندانہ مضامین وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے ذیلی عنوان "اثرات" کے تحت ان شعرا کی تفصیل پیش کی گئی ہے، جنھوں نے خاقانی کی شاعری سے فیضان حاصل کیا ہے یا پھر ان کے خیالات کو اپنی شاعری میں اپنے انداز سے موضوع بنایا ہے یعنی خاقانی کی شاعری سے جن شعرا نے اثر قبول کیے ہیں ان کا ذکر اس باب میں مجموعی طور پر کیا گیا ہے۔ خاقانی کے مقلدین میں ایسے ایسے شعرا نظر آتے ہیں جو تاریخ و ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ چوتھے باب میں خاقانی شروانی کے قصائد کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ آخری باب میں کتابیات کی فہرست مرتب کی گئی ہے۔ جس میں اس کتاب کی تیاری میں جو کتابیں بطور حوالہ استعمال کی گئی ہیں ان کا ذکر موجود ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کے فارسی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کی غیر منظور شدہ شکل ہے جو ڈگری کے لیے جمع نہ ہو سکا لیکن یہ خوش قسمتی ہے کہ یہ کتابی شکل میں شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل کا یہ کام بلاشبہ کلاسیکی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ جس کے توسط سے اردو فارسی میں تحقیق کرنے والے اسکالروں کو فائدہ پہنچے گا۔ خاقانی شروانی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کرکے ڈاکٹر ساحل نے ایک اہم راہ ہموار کر دی ہے جو آنے والے محقق کے لیے ایک خوش آئند کام ہے۔ کتاب اپنے باطنی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے۔ گٹ اپ دیدہ زیب ہے، کمپوزنگ عمدہ اور طباعت صاف ستھری ہے۔ امید کہ یہ کتاب تنقید و ادب کے قاری کے لیے بھرپور مواد فراہم کرے گی۔

☆☆☆

بقیہ صفحہ ۳ سے آگے

کو ان کی شخصیت اور خدمات سے روشناس کرانے کا بھی کام کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اداریے کا یہ اقتباس:

"رواں سال تاریخ کا ایک حصہ بننے سے قبل بہار کے لوگوں کو بالعموم مگر مسلمانوں کو بالخصوص شاہ مشتاق احمد صاحب کی رحلت کی شکل میں ایک اور گہرا داغ دے گیا جس کی کسک وہ تمام لوگ محسوس کریں گے جنھوں نے شاہ صاحب مرحوم کا دور سیاست دیکھا تھا ان سے ملے تھے، ان سے گفتگو کی تھی، سیاست میں ان کے رفیق کی حیثیت سے رہے تھے یا جنھیں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ نئی نسل کو تو شاید اس کا احساس بھی نہیں ہوگا کہ کیسی شخصیت ان کے درمیان سے اٹھ گئی۔ بہت کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ بہار کے لیے، بہار کی اردو تحریک کے لیے، ملت کے لیے اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کی خدمات کیا تھیں۔"

الحاج غلام سرور کی قیادت میں مجاہدین اردو کا جو قافلہ بنا تھا ان میں سے ایک ایک کرکے لوگ رخصت ہوتے جارہے ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں مولانا بیتاب صدیقی کا انتقال ہوا۔ ۱۹۹۹ء میں سید تقی رحیم رحلت فرما گئے اور اب ۲۹ دسمبر ۲۰۰۲ء کو شاہ مشتاق احمد بھی داغ

مفارقت دے گئے۔ غرض کہ تحریکِ اردو کے بڑے بڑے ستون گرتے جارہے ہیں۔ قائدینِ اردو کی پہلی صف خالی ہوتی جارہی ہے۔ اردو کا درد رکھنے والوں اور اردو تحریک سے جڑے ہوئے لوگوں کے لیے یہ اموات یقیناً باعثِ رنج و ملال ہیں۔ اردو تحریک کے سرگرم رکن اور معروف صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے شاہ مشتاق احمد کی رحلت پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ:

"مجاہدینِ اردو کی پہلی صف بہت تیزی سے خالی ہوتی جارہی ہے۔ پہلی صف میں اب چند ہی بزرگ رہ گئے ہیں۔ ان میں کئی چراغِ سحری ہیں۔ پیچھے صرف گرد و غبار ہے۔ اس دھند میں پتا نہیں چلتا کہ دوسری صف اس قافلے کے کتنا پیچھے ہے اور اس میں کون لوگ ہیں"۔

(قومی تنظیم، پٹنہ، ۳رجنوری ۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر ریحان غنی کی یہ خصوصی تحریر مرحوم شاہ مشتاق احمد کے انتقال پر نہ صرف اظہارِ جذبات اور ان کے تئیں اظہارِ عقیدت ہے بلکہ اردو کا درد رکھنے والوں اور اردو تحریک سے جڑے ہوئے لوگوں کے لیے دعوتِ فکر و عمل اور تازیانۂ عبرت بھی ہے۔

شاہ مشتاق احمد کا انتقال ہمارے لیے واقعی ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ شاہ صاحب کی موت سے ہم نے اپنے درمیان سے ایک مجاہدِ اردو، ایک دردمند ملت، ایک بیدار مغز سیاست داں اور دانشور کھو دیا ہے۔ شاہ مشتاق احمد نے ملک و ملت اور اردو زبان و ادب کی جو بے لوث خدمت کی ہے اسے ایک لمبی مدت تک یاد رکھا جائے گا اور ان کے کارنامے آئندہ نسل کے لیے یقیناً مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

تری بے لوث خدمت کو تری بے باک فطرت کو
زمانہ برسوں روئے گا تری سچی محبت کو

☆☆☆

والی آسی

لکھنؤ اسکول کے نمائندہ اور معروف شاعر تھے۔ اپنی خوب صورت شاعری کے سبب عوام و خواص دونوں حلقوں میں مقبول تھے۔ ان کی شاعری کے قدر دانوں میں بیرونِ ہند کے بے شمار ادب نواز بھی شامل ہیں۔ ہند و پاک کے علاوہ بیرونِ ہند کے مشاعروں میں احترام کے ساتھ مدعو کیے جاتے اور محبت کے ساتھ سنے جاتے تھے۔ ان کے دو مجموعے 'شہد' اور 'موم' شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔ صرف ۶۲ سال کی عمر میں ۱۲راپریل کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوا اور اپنے وطن لکھنؤ میں تدفین عمل میں آئی۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد بھی خاصی ہے۔

ڈاکٹر مجید عارفی

عصری حسیت کے حامل اور صالح رجحانوں کے امین شاعر و ادیب تھے۔ اپنے والد حضرت عارف عباسی سے شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ذاتی مطالعہ، علمی لیاقت، قوتِ مشاہدہ اور خداداد صلاحیتوں کے طفیل ان کی شاعری کو جلا ملی۔ تنقیدی شعور بھی پختہ تھا۔ ان کے تبصرے اور مضامین جرائد و رسائل کی زینت بنتے رہتے تھے۔ بہرائچ میں ڈگری کالج میں اردو کے استاد تھے۔ عمر نے وفا نہ کی صرف ۵۳ سال کی عمر میں ۲۵رجولائی کو انتقال ہوا۔ مجموعۂ کلام 'شہر بے چراغ' میں حال ہی میں منظرِ عام پر آیا تھا۔

سریندر پرکاش

سریندر پرکاش کا جدید افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام تھا۔ انھیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا تھا۔ ۹رنومبر کو ممبئی میں انتقال ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں لائل پور (حال پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد دہلی آگئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ سریندر پرکاش نے یہاں دہلی میں محنت مزدوری کرکے ابتدائی دن گزارے اور ان تجربوں سے اپنے قلم کی آبیاری کرکے ایک سرسبز و شاداب ادب کا جہاں اپنے لیے مہیا کیا۔ پچاس کی دہائی میں نئے افسانے کی تخلیق میں ایک نمایاں مقام پیدا کیا اور جدید لکھنے والوں کی فہرست میں اولیت کے درجے پر پہنچے۔ ۱۹۶۸ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" شائع ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں 'برف پر مکالمہ' ۱۹۸۸ء میں 'بازگوئی' اور ۲۰۰۲ء میں 'حاضر حال جاری' شائع ہوئے۔ انھوں نے بہت کم عمری سے لکھنا شروع کردیا تھا۔ پہلی کہانی صرف گیارہ برس کی عمر میں ہفتہ وار 'پارس' میں شائع ہوئی تھی۔

صہبا لکھنوی

برصغیر کے ان بزرگ اور ممتاز شعرا میں تھے جن کا دونوں طرف یکساں احترام کیا جاتا تھا۔ کراچی سے شائع ہونے والا رسالہ 'افکار' اپنے معیار کے اعتبار سے اردو دنیا میں منفرد مقام کا حامل ہے۔ صہبا صاحب نے اپنی ادارت میں اس رسالے کو جو مقام و وقار بخشا وہ اہلِ نظر جانتے ہیں۔ ادبی صحافت کی تاریخ سازی میں اس کا ایک اہم رول ہے۔ صہبا صاحب کا ابتدائی زمانہ لکھنؤ اور بھوپال میں گزرا۔ بھوپال سے پہلا مجموعۂ کلام 'ماہ پارے' ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا اور یہیں 'افکار' کا آغاز ہوا۔ دوسرا مجموعہ 'خاکِ پاکستان' جاکر شائع کیا۔ ان کی تصنیفات میں 'اقبال اور بھوپال' بھی ایک اہم کتاب ہے۔ ۳۱رمارچ کو کراچی میں انتقال ہوا۔ (باقی آئندہ)

بقیہ صفحہ ۸ سے آگے

ان کی کئی کتابیں اہلِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ ان کی تصنیفات کی فہرست کافی طویل ہے تالیفات بھی خاصی ہیں۔ بہت سی کتابوں کے تراجم بھی انھوں نے کیے۔ ان کتابوں میں 'شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'، 'امریکی عدالت کے شاندار کارنامے'، 'بھارت آج اور کل'، 'بابائے اردو مولوی عبدالحق'، 'ڈاکٹر ذاکر حسین۔ سیرت و شخصیت'، 'گاندھی جی اور ان کے خیالات'، 'سرسید احمد خاں اور ان کی معنویت موجودہ دور میں'، 'مشاہیر کے خطوط اور ان کے مختصر حالات'، 'اقبال۔ دانائے راز'، 'مسولانا محمد علی۔ ایک مطالعہ'، 'ڈاکٹر راجندر پرشاد عظیم رہنما اور پہلے راشٹرپتی' شامل ہیں۔ عبداللطیف اعظمی کو ان خدمات پر اترپردیش اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، آل انڈیا میر اکادمی اور دوسرے کئی اداروں نے اعزازات و انعامات سے نوازا۔ مرحوم کا طویل مدت بیمار رہ کر ۱۸ر مئی کو نئی دہلی میں انتقال ہوا۔

خار زتشی دہلوی

داغ اسکول کے ایک معتبر نمائندہ شاعر تھے، تمام عمر پرانی قدروں کو سینے سے لگائے رہے۔ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے بھی اسلاف کا نمونہ تھے۔ دہلی کی ٹکسالی زبان اور اس دور کی آخری کڑی سمجھے جاتے تھے۔ داغ کی زبان کے امین تھے۔ نواب سائل دہلوی کے شاگرد و جانشین تھے۔ دو مجموعے 'خارزار' اور 'خلش خار' شائع ہوئے۔ آخر عمر میں دہلی ان سے چھوٹ گئی تھی اور اپنی اکلوتی بچی کے پاس ممبئی میں مقیم تھے کہ وہیں ۸۸ سال کی عمر میں ۳۰رجنوری کو انتقال ہوا۔ پیدائش ۱۵رجنوری ۱۹۱۵ء۔

۲۰۰۲ء میں رخصت ہونے والے اردو کے کچھ اہلِ قلم

پہلی قسط

ع: ڈوبنے پر بھی ستاروں کی ضیا باقی ہے

قمر سنبھلی
۵۵۷۴-نئی سڑک، دہلی-۶

ماضی کا جزو بن جانے والے سال ۲۰۰۲ء کتنے ہی حادثے، تجلیاں اور کراہیں اپنے دامن میں سمیٹے ہم سے رخصت ہو گیا۔ جہاں بین الاقوامی طور پر یہ سال مایوس کن رہا وہیں ملکی سطح پر بھی بہت سی بھیانک یادیں چھوڑ گیا۔ اردو دنیا کو بھی کتنے ہی روشن ستاروں سے محروم ہونا پڑا۔ زیر نظر مضمون میں ایسے ہی کچھ اردو کے صاحبانِ قلم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اس رخصت ہونے والے سال میں ہم سے جدا ہو گئے۔ یہ مختصر ذکر ان کو ایک خراج عقیدت بھی ہے اور مرحومین کی خدمات کا ادنیٰ سا اعتراف بھی۔

کیفی اعظمی

اردو کے ایک ایسے ممتاز شاعر تھے جنھیں اس وقت ہندو پاک کا عظیم شاعر سمجھا جاتا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ان کی شخصیت کئی اعتبار سے منفرد ممتاز تھی۔ ۱۹۲۵ء میں یو پی کے ایک معمولی گاؤں اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے والے کیفی اردو شعر و ادب میں ایک تاریخ بنا کر ۸۳ سال کی عمر پا کر ۱۰ مئی کو ممبئی کے جسلوک ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ ترقی پسند تحریک کے صف اول کے رہنما کیفی نے تمام عمر پسماندہ افراد و طبقات کی فلاح کی فکر اور بساط بھر خدمت میں گزار دی۔ ان کو ملک و قوم سے بھرپور عزت بھی ملی اور خدمات کا بھرپور اعتراف بھی کیا گیا۔ فلمی وابستگی سے انھیں عوام میں شہرت ملی تو ادبی خدمات نے ان کو اردو حلقوں میں محبوبیت اور مقبولیت دلائی۔ کیفی اعظمی کا پہلا شعری مجموعہ "جھنکار" ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا دوسرا مجموعہ 'آخر شب' ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا، تیسرا مجموعہ 'آوارہ سجدے' ۱۹۶۳ء میں چھپا، چوتھا مجموعہ 'میری آواز سنو' (فلمی گیتوں پر مشتمل) ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ ان کے علاوہ ساتھ پر ایک طویل خاکہ اور انجلس کی فلمی شاعری ابھی طباعت کی منزلوں سے گزر رہے۔ ان کی آخری تخلیق 'سرمایہ' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ ان کی ان خدمات پر جو اعزازات و انعامات ملے ان میں اتر پردیش اردو اکادمی کے کئی ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکادمی کے کئی ایوارڈ، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، لوٹس ایوارڈ، پدم شری (جسے بعد میں انھوں نے احتجاجاً سرکار کو واپس کر دیا تھا)، ساہتیہ اکادمی فیلو شپ ایوارڈ، افرو ایشین لٹریری ایوارڈ، دہلی سرکار و اردو اکادمی کا عظیم ایوارڈ، گیانیشور ایوارڈ وغیرہ ان کے علاوہ بھی کئی اور ادبی، ثقافتی اور قومی ایوارڈ انھیں ملے۔ ان کے کلام کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔

آل احمد سرور

ممتاز نقاد، معتبر شاعر اور معروف ادیب و استاد تھے۔ تمام عمر اردو کے مختلف میدانوں میں سرگرم عمل رہے۔ تعلیم و تعلم کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ اقبالیات پر بھی ان کی قابل قدر خدمات ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام کو اعتبار بخشنے میں مرحوم کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۹ ستمبر ۱۹۱۲ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ بریلی، بھیت، غازی پور، آگرہ اور علی گڑھ میں تعلیمی مراحل طے کیے۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ طلبہ یونین کے نائب صدر بھی رہے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد مادر علمی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ صدر شعبہ اردو اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین رہے۔ ۱۹۷۰ء سے مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس کے عہدے پر فائز رہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں یادگار ہیں جن میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'سلسبیل' جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ دوسری تصنیفات میں 'نئے اور پرانے چراغ'، 'تنقید کیا ہے'، 'ادب اور نظریہ'، 'مسرت سے بصیرت تک'، 'عرفانِ اقبال'، 'اقبال اور ان کا فلسفہ'، 'اقبال نظریہ اور شاعری'، 'جدید دنیا میں اسلام' اور 'اردو میں دانشوری کی روایت' خاصی مقبول ہوئیں۔ آپ کی آپ بیتی 'خواب باقی ہیں' ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ آپ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ سہ ماہی 'اردو ادب' اور 'ہماری زبان' کے مدیر رہے۔ ملکی اور غیر ملکی بے شمار کانفرنسوں، سیمیناروں میں شرکت کی۔ مختلف اعزازات سے بھی نوازے گئے۔ حکومت نے ۱۹۹۲ء میں 'پدم بھوشن' عطا کیا۔ اس کے علاوہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب سوویت ایوارڈ، یو پی اردو اکادمی ایوارڈ، دہلی اردو اکادمی ایوارڈ، اقبال سمان سے بھی متصف ہوئے۔ ۱۹۸۷ء میں صدر پاکستان کا طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔ ۹ فروری ۲۰۰۲ء کو دہلی میں انتقال ہوا اور علی گڑھ میں تدفین ہوئی۔

جون ایلیا

اردو شاعری کا ایک ایسا نام جسے عالمی شہرت کے ساتھ عوام و خواص دونوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے ایک مقام حاصل کیا۔ اب سے تقریباً ۷۲ سال قبل یو پی کے ایک مردم خیز قصبہ امروہہ میں آنکھ کھولنے والے جون وطن سے دور ۸ نومبر کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ جون ایلیا ۱۹۵۸ء میں ہجرت کر کے کراچی (پاکستان) چلے گئے تھے۔ انھوں نے وطن سے جسمانی ہجرت ضرور کر لی تھی مگر وہ آخر تک اس ہجرت کو دل سے قبول نہ کر سکے اور جذباتی طور پر برابر اپنے وطن سے جڑے رہے۔ عربی، فارسی کے عالم تھے۔ ایک طویل مدت تک 'عالمی ڈائجسٹ' کے مدیر رہے۔ مجموعہ کلام 'شاید' بہت مقبول ہوا اور ادبی حلقوں میں ایک مدت موضوع بحث رہا۔ انھیں صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا تھا۔ دہلی میں اطلاع ہے کہ ان کا جشن منایا جا چکا ہے۔

مصور سبزواری

جدید غزل کے معماروں میں سے تھے۔ ترقی پسند شاعری کے رد عمل کے طور پر بیسویں صدی کے نصف آخری ابتدا میں جو جدیدیت کی تحریک چلی تھی اور شعری رویوں میں ایک تبدیلی آئی تھی اس تبدیلی کے لانے میں جو نام سامنے آتے ہیں ان میں مصور کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۳۲ء کو سنبھل میں پیدا ہونے والے مصور کی عمر کا ایک بڑا حصہ درس و تدریس کے سلسلے میں ہریانہ کے ضلع گوڑ گاؤں میں گزرا۔ مصور سبزواری کی ابتدا افسانہ نگاری سے ہوئی۔ کئی ناول منظر عام پر آئے لیکن انھیں شہرت ایک جدید شاعر کی حیثیت سے ملی۔ ان کی تصنیفات میں 'بکھی دوپہر، چل'، 'بزرگ آتش سوار'، 'رشتے ٹوٹنے کا موسم'، 'دہلیز پر رات' شام اور دو معمال پانچ شعری مجموعوں کے علاوہ دو ناول نہت عقر کے سسر افراد اور زیر دھواں سائبان سے اشتہا' قابل ذکر ہیں۔ انہی کے ساتھ 'عمر بھر کی تنہائی'، 'کوئی بھی راکھ' اور 'ہمارے بعد اجالا ہے' مخواہات سے جدید منتخب جرائد میں قسط وار شائع ہوئے۔ مصور سبزواری کو ان کی ادبی خدمات پر ہریانہ اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ستر سال کی عمر پا کر ۱۳ جون کو انتقال ہوا۔

نعیم صدیقی

برصغیر کے معتبر اور صاحب نظر اہل قلم اور دانشور تھے۔ بالخصوص اسلامی ادب کے حوالے سے ان کی شناخت تھی۔ ادیب، شاعر اور صحافی کی حیثیت سے ان کی خدمات کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ عمر کے آخری لمحوں تک خدمت ادب میں مصروف رہے اور ان کا قلم متحرک رہا۔ ۲۵ ستمبر کو طویل علالت کے بعد لاہور میں وفات ہوئی۔ ۴ جون ۱۹۱۶ء کو خان پور تحصیل چکوال میں پیدا ہوئے۔ اصل نام فضل الرحمن تھا لیکن دنیائے اردو میں نعیم صدیقی کے نام سے جانی ہے۔ نعیم صاحب کی مایہ ناز تصنیف 'محسن انسانیت' نے غیر معمولی مقبولیت پائی۔ دیگر تصنیفات میں 'تعلیم کا تہذیبی نظریہ'، 'اقبال کا شعلہ نوا'، 'تغیر تعمیر'، 'معروف و منکر'، 'معرکہ دین و سیاست'، 'شعلہ نوا اور انسانیت'، 'تحریکی شعور'، 'سفر نامہ حجاز'، 'بہار و ادب و ایمان' قابل ذکر ہیں۔ شعری مجموعے 'خطا' 'خیال اور افسانوی ادب میں 'زلزلے' اور 'ٹھنڈی آگ' بھی مقبول ہوئے۔ نعتیہ مجموعہ 'نور کی ندیاں رواں' نعتیہ شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحافت سے بھی آپ کی وابستگی رہی۔ 'ترجمان القرآن'، 'سیارہ'، 'مسلمان'، 'کوثر'، 'چراغ راہ' اور 'شہاب' سے بحیثیت مدیر اور معاون تعلق رہا۔ قیمتی قدروں کے ترجمان داعی کی حیثیت سے آپ کی خدمات یاد رکھی جائیں گی۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

جہاں ایک طرف معروف عالم دین تھے وہیں صاحب اسلوب اہل قلم تھے۔ ان کی ہمہ جہت خدمات متوجہ کرتی ہیں۔ آپ کی اردو تصنیفات کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو دربھنگہ ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں جالہ میں پیدا ہونے والے مجاہد الاسلام قاسمی قضا کی مسند پر جلوہ گر رہ کر بے شمار مصیبت زدوں کے لیے انصاف پر مبنی اپنے فیصلوں سے عدل و انصاف کی علامت بنے رہے۔ تدریسی خدمات کے ساتھ امارت شرعیہ سے بھی وابستہ رہے۔ آخر میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ ان کے علمی کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں ان کی نگرانی میں 'فقہی انسائیکلوپیڈیا' کا اردو میں چالیس جلدوں پر مشتمل مکمل ترجمہ بالخصوص قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ 'الوقف' اور 'اسلامی عدالت' ان کی اردو تصنیفات میں اہم مقام کی حامل ہیں۔

عبد اللطیف اعظمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایسے دانشوروں میں سے تھے جن کی شخصیت کو کسی بھی طرح جامعہ سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یکم مارچ ۱۹۱۷ء کو موضع بندی کلاں ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ تمام عمر بڑی خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمت کرتے رہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

اڈیٹر: خلیق انجم

پرنٹر، پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: شمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، نئی دہلی

مالک: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر ۲۱۲، راؤز ایوینیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

قیمت (فی شمارہ) دو روپے — سالانہ ۵۰ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)

Phones: 23237210, 23236299 Fax: 011-23239547

E-mail: urduadabodil@bol.net.in